مقالات

اکبر کا دینِ الٰہی

اور

سید احمد شہیدؒ کی حکومتِ الٰہی

از جناب حافظ محمد زکریا صاحب، مسجد قدس، امرتسر

جس طرح ہر فرد ایک مستقل اور قائم بالذات ذہن کا مالک ہوتا ہے جو اس کے افکار و خیالات کو ایک خاص طرز پر ترتیب دیتا اور اس کی جمیع حرکات کا رُخ معین کرتا ہے، اسی طرح ہر سوسائٹی بھی ایک اجتماعی نفس اور اجتماعی ذہن کی حامل ہوتی ہے جو اس کے اجتماعی افکار کی تسوید و تحلیل کرتے اور اس کی تمام حرکات کی سمت قائم کرتے ہیں۔ لہٰذا اگر کسی سوسائٹی کے متعلق یہ معلوم کرنا مقصود ہو کہ وہ کس دھارے پر بہہ رہی ہے، کس منزل کی طرف بڑھ رہی ہے اور اس کی حرکت کا حقیقی رخ کیا ہے تو اس کی واحد صورت یہ ہے کہ اس کی فکری حالت کا پورا پورا جائزہ لیا جائے اور اس کے اجتماعی افکار کی تحلیل کرکے یہ معلوم کیا جائے کہ اس کا فکر کن کن اجزاء اور کس کس قسم کے اجزاء سے مرکب ہے، اور یہ کہ ان اجزا کی خاصیت فی الواقع کیا ہے۔ صرف اسی طرح یہ بات معلوم کی جاسکے گی کہ حرکت کا رخ کیا ہے اور آیا یہ رخ وہی ہے جو فی الواقع ہونا چاہیے یا کچھ اور۔

ہندوستان کی مسلم سوسائٹی ہندوستان کی موجودہ مسلم سوسائٹی کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے ہر مسلمان پر یہ بات واجب ہے کہ وہ جس سوسائٹی کا فرد ہے اس کی صحیح ذہنی کیفیت کو معلوم کرنے کی کوشش کرے اور اس کے افکار اور اس کی حرکات سے علیٰ وجہ البصیرت یہ جانے کہ وہ کس طرز پر سوچتی اور کس سمت پر حرکت کرتی ہے۔ بادی النظر میں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ سوسائٹی کی مجموعی حرکت صرف اسلام کی طرف اور اسلام کے لیے ہو رہی ہے۔ لیکن جب اس کی ذہنی کیفیت کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو وہ ایک شدید بحران میں مبتلا نظر آتی ہے۔ متضاد افکار اور متنوع نظریات

اس کے ذہن پر چھا رہے ہیں۔ وہ اضداد کی ایسی دنیا ہے جس میں ہر چیز اپنا عکس ساتھ لیے چل رہی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پریشان خیالی اور عدم استقلال اس کا طغرائے امتیاز بن گئے ہیں۔ یہ تضاد یوں تو بہت وسیع اور جامع ہے لیکن یہ وسعت اور جامعیت دراصل ایک ایسے بنیادی تضاد کی رہین منت ہے جس کی تعیین اب کوئی زیادہ مشکل امر نہیں رہا ہے۔ ملک کی موجودہ آئینی جدوجہد اور سیاسی اتار چڑھاؤ نے اس تضاد کو بہت واضح کر کے سامنے رکھ دیا ہے۔ جو لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ مسلم سوسائٹی ابتداء میں کس طرح وجود میں آئی اور کس طرح اور کس طریقے سے وہ اپنی منزل کی طرف بڑھی اور کس طرح بآخر کار وہ ایک مسلکی ریاست (Ideological State) کی پیدائش کا سبب بنی، ان کے لیے یہ بات سمجھنا کچھ دشوار نہیں کہ اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے مسلم سوسائٹی ایک ایسی سوسائٹی ہوتی ہے جس کی پیدائش ایک مخصوص اصولی دعوت سے ہوتی ہے اور جس کا وجود ایک صاحب دعوت جماعت کی طرح ایک خاص اصول کے تمسک اور ایک خاص انقلابی مشن کی علمبرداری سے پیدا ہوتا اور اس کے ترک سے مٹ جاتا ہے۔ جونہی اس کے اجتماعی افکار اس خاص اصول کی روشنی سے مستفید ہونا ترک کر دیتے ہیں، جس نے اسے یہ انقلابی وجود عطا کیا تھا اور اس کی بجائے کچھ دوسرے اصول اس کے ذہن پر حاوی ہونے لگتے ہیں، تو اس پر وہ بحران کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو آج ہندوستان کی مسلم سوسائٹی پر ہو رہی ہے۔ اب وہ کون سے اصول ہیں جو مسلم سوسائٹی کی اصلیت کو زائل کر دیتے ہیں، تو اس کے لیے بھی ایک بنیادی فارمولا کافی ہے اور وہ یہ کہ بندگی خدا (اپنے وسیع معنوں میں) اور اتباع ہدایت الٰہی کے سوا ہر وہ چیز جس پر اجتماعی زندگی کی تعمیر کی جائے وہ اس سوسائٹی کی اصل یعنی اسلام کے ضد اور منافی ہے۔ اس وقت ہندوستان کی مسلم سوسائٹی اپنی اجتماعی زندگی کی تعمیر جن اصولوں پر کر رہی ہے وہ اسلام کے ضد ہیں۔ اس کے افکار اب بندگی خدا کے اصول کی بجائے مغرب کے تصور قومیت سے بنتے اور معین ہوتے ہیں۔ اس کی حرکات جذبۂ اطاعت الٰہی کی بجائے جذبۂ قومیت سے (عام اس سے کہ قومیت نسلی ہو یا وطنی) وجود پذیر ہوتی ہیں۔ قومیت کا تصور اپنی پیدائش کے لیے کسی اصول کا منت کش نہیں ہوتا بلکہ وہ چند نسلی، وطنی، تاریخی اور ثقافتی عوامل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انقلابی جماعت اور نسلی یا وطنی قومیت میں آگ پانی کا تضاد ہے

ایک کا وجود دوسرے کے لیے پیغام موت ہے۔ ایک کا بقا دوسرے کے لیے سامان فنا ہے۔ اس حقیقت کو ذرا اور وضاحت سے سمجھنے کے لیے ہمیں قومیت کے مغربی تصور کی ایک جھلک دیکھ لینی چاہیے۔

مغربی تصورِ قومیت اور اسلامی قومیت

اقوام یورپ نے کرۂ ارضی پر سیاسی تسلط قائم کر کے اپنی تہذیب کو بھی جہانی تہذیب بنا دیا ہے۔ یہ تہذیب جہاں جہاں بھی پہنچی ہے حاکم قوم کی تہذیب ہونے کی وجہ سے بہت جلد پھیلتی گئی ہے کہ الناس علیٰ دین ملوکہم ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔ لیکن جب ایک قوم کی تہذیب دوسری قوم میں پہنچی ہے تو لامحالہ وہ اپنا فکری نظام، جس کے بل بوتے پر وہ پروان چڑھی ہے، ساتھ لے کر جاتی ہے، اور بالآخر مفتوح قوم کو جسماً ہی نہیں بلکہ روحاً بھی، رفتار و گفتار ہی میں ہی نہیں بلکہ افکار و خیالات میں بھی اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہے، حتیٰ کہ محکوموں میں بھی وہی جذبات و رجحانات اور وہی امیال و عواطف پرورش پانے لگتے ہیں جو حاکم قوم کے خمیر میں ہوتے ہیں۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں سے حاکم و محکوم میں آویزش شروع ہو جاتی ہے اور شاگرد استاد کے رو در رو آموختہ سنانے لگتا ہے۔ انقلاب فرانس اور نپولین کے زوال کے بعد یورپ کے فکر سیاسی میں دو چیزیں شدت سے نمودار ہوئی تھیں۔ ایک احساس قومیت (Nationality)، دوسرا جذبۂ آزادی (Liberty)۔ انیسویں صدی کی تاریخ یورپ انہی دو عوامل کی جولانیوں کی داستان ہے۔ یہی وہ محرکات ہیں جو پہلے ۱۹۱۴ء میں اور پھر ۱۹۳۹ء میں دو جہانی جنگوں کی صورت میں اپنا نتیجہ ظاہر کر چکے ہیں اور جن کی قوت بربادی ابھی گئی اور جنگوں کے بیج بوتی چلی جا رہی ہے۔ قومیت کا وہ تصور جو انیسویں صدی میں ایک زبردست سیاسی عامل کی صورت میں یورپ میں نمودار ہوا، ریاست اور کلیسا کی دیرینہ آویزش کی وجہ سے خالص میکیاویلی (Machiavelli) طرز فکر کی پیداوار تھا جس میں اخلاق کو انسان کی اجتماعی زندگی کے دائرۂ عمل سے بالکل خارج کر دیا گیا ہے۔ اس قومیت کی بنیاد تمام تر وطن، نسل یا زبان پر تھی۔ جب قومیت کا یہ تصور اقوام یورپ سے دوسرے ملکوں تک پہنچا تو اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا یعنی جگہ جگہ وطنی اشتراک اور نسلی توارث کی بنا پر احساس انفرادیت پیدا ہوا اور اس نے اپنے استقرار کے لیے اقتدار کی طلب شروع کر دی بعینہ یہی حالت اس وقت ہندوستان کی بھی ہے۔ یہاں مسلمانوں میں دو ہی قسم کے احساسات پائے جاتے ہیں۔ یا تو یہ کہ اشتراک وطنی کی بنیاد پر ایک متحدہ قومیت تیار کی جائے اور وہ اپنے لیے اقتدار حاصل کرے یا یہ

نسلی توارث کی بنا پر مسلمانوں میں ایک مستقل بالذات قوم ہونے کا جذبہ پیدا کیا جائے جس کا لازمی نتیجہ علیحدگی کی خواہش اور علیحدہ اقتدار کے حصول کی طلب ہے۔ لیکن اگر مندرجہ بالا تجربہ کو سامنے رکھا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ یہ دونوں طرح کے احساسات درحقیقت ایک ہی تخم کی پیداوار اور ایک ہی مٹی سے نشوونما حاصل کرتے ہیں۔ حقِ خودارادیت (Self-determination) کا طریقہ پہلی جنگ عظیم کے بعد پریذیڈنٹ ولسن نے یورپ کی ان چھوٹی چھوٹی قومیتوں کی آزادی کے لیے استعمال کیا تھا جن میں احساس قومیت نے علیحدگی اور آزادی کی طبعی خواہش پیدا کر دی تھی۔ استاد مغرب کا یہ آموختہ اب یہاں بھی دہرایا جا رہا ہے۔ کیونکہ جس قسم کا بیج بویا گیا تھا اس کا پھل بہرحال اسی صورت میں ظاہر ہو سکتا تھا۔

لیکن اسلام جس قسم کی سوسائٹی پیدا کرنا چاہتا ہے اور جس کی مثال مدینہ طیبہ کی زندگی میں بخوبی نظر آسکتی ہے، وہ نسل و وطن کی آلائشوں سے پاک ایک خالص انقلابی سوسائٹی ہے۔ انقلابی سوسائٹی وطنی یا نسلی قومیت سے بالکل جداگانہ چیز ہے۔ اس کے لیے نہ تو کوئی خاص خطۂ ارضی وجہ معبودیت حاصل کر سکتا ہے اور نہ اسے کسی ایسے کلچر کے ساتھ، جو محض نسلی توارث سے اسے حاصل ہوا ہو، اندھی عصبیت ہوتی ہے۔ اسے جو کچھ دلچسپی ہوتی ہے اپنے اصولوں سے ہوتی ہے۔ وہ نسل و وطن کے سارے بت توڑ دیتی ہے اور خالص انسانیت کو اپنا کعبۂ مقصود ٹھیراتی ہے۔ وہ قومی کلچر اور وطنی تہذیب کی نہیں بلکہ اس تہذیب کی محافظ ہوتی ہے جو صرف اس کے اصولوں پر تعمیر کی گئی ہو۔ اس کی قومیت اشتراک وطنی یا توارث نسلی کے رشتے سے نہیں بلکہ ان اصولوں کے رشتے سے تعمیر ہوتی ہے جن کی وجہ سے وہ وجود میں آئی ہے۔ لہٰذا صرف وہی لوگ اس کی قومیت میں شمار ہو سکتے ہیں جو عادۃً نہیں بلکہ عمداً، نسلاً نہیں بلکہ ارادۃً ان اصولوں کو بالفعل اختیار کر چکے ہوں جن کی بنیاد پر وہ انسان کے نظامِ زندگی کو کھڑا کرنا چاہتی ہے۔ وہ لوگ کسی طرح بھی اس قومیت میں شمار نہیں کیے جا سکتے جو عملاً اور اعتقاداً اس کے اصولوں سے انحراف کر چکے ہیں۔ ایسی قومیت اپنی فطرت کے لحاظ سے بڑھتی پھیلتی اور وسعت اختیار کرتی جاتی ہے تاآنکہ وہ ساری انسانی آبادی کو اپنے آغوش میں لے لے۔ اس کے برعکس وطنی یا نسلی قومیت کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں کہ کسی ایک گوشے میں سمٹ کر اپنے شوقِ ربوبیت کی داد دے لے۔ اس کے لیے اس گوشے سے باہر نکلنے کی اگر کوئی صورت ہے تو صرف یہ کہ وہ

ملوکیت (Imperialism) کے اصولوں پر کاربند ہو جائے۔ لیکن ملوکیت استبداد کی ایک ایسی شکل ہے کہ خود ملوکیت پرست کو بھی اس کے جواز کے لیے سینکڑوں قسم کی تاویلوں اور گوناگوں طرز کی تعبیروں سے کام لینا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملوکیت پسند قوم کی طرف بنی نوع انسان کے لیے کشش کا کوئی سامان نہیں۔ انقلابی قومیت اور مغربی طرز کی وطنی یا نسلی قومیت میں یہ فرق اب اتنا واضح اور بیّن ہو چکا ہے کہ کسی لمبے چوڑے استدلال کی ضرورت نہیں رہی۔

اسلام کی انقلابیت اور ہندوستان کی تاریخِ مسلمین

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کسی انقلابی نظریے کی حامل صرف وہ جماعت ہوتی ہے جس کی تاسیس ایک مستقل مسلک اور عقیدہ پر کی گئی ہو اور جس کی تمام وفاداریاں اور اطاعت کیشیاں صرف اسی مسلک اور عقیدہ کی بنا پر ہوں۔ نفرت و محبت کے تمام رشتے اور دوستی اور دشمنی کے تمام معاملے مسلک اور عقیدہ کی روشنی میں ہی طے پائیں۔ ایسی جماعت کے افراد میں باہمی رشتہ ہائے محبت و اخوت خون کے رشتوں سے زیادہ مضبوط اور ماں جائیوں کے تعلق سے زیادہ مستحکم ہوتے ہیں اور ایسی ہی جماعت جب کوئی جہانی نصب العین سامنے رکھ کر انسانی سوسائٹی کی تعمیر اپنے مخصوص اصولوں پر کرنے کے لیے میدان میں آتی ہے اور اپنے اصول کے مخالف ہر چیز سے برسرِپیکار ہو جاتی ہے تو انقلابی جماعت کہلاتی ہے۔ جو لوگ اسلام اور تاریخ اسلام سے بخوبی واقف ہیں انھیں یہ بات باور کرنے میں تامل نہیں ہوگا کہ اسلام فی الواقع اسی قسم کی جماعت تیار کرنا چاہتا ہے اور اس کی کامیابی یا زوال اسی جماعت کی تنظیم، قیادت اور قوت کارکردگی کے طبعی اسباب کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ لیکن اسلام کی انقلابیت ہندوستان کی طویل تاریخ مسلمین میں قریباً ایک اجنبی شے ہے۔ ہندوستان میں اسلام کو وارد ہوئے کچھ اوپر ہزار سال ہوگئے ہیں۔ اس طویل عرصہ میں پاکباز صوفی، دیندار عالم، متقی بادشاہ اور خدا پرست امرا سب ہی منظرِ شہود پر جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ بڑی بڑی خانقاہیں اور ان کے لامحدود اوقاف، عالیشان مقبرے اور ان کے فلک بوس مینار زمانہ کی ستمگرانہ خواہشات کے علی الرغم ہندی مسلمانوں کی شوکتِ رفتہ پر آج تک مجسم شہادت بن کر کھڑے ہیں۔ پُرشکوہ محلات اور ناقابلِ تسخیر قلعے، مرمریں مساجد اور بلوریں حمام آج بھی مسلمان بادشاہوں کے جاہ و جلال کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ لیکن جو چیز نہیں نظر آتی وہ صفحۂ تاریخ پر

کسی زندہ پائندہ تحریک اسلامی کی یادگار ہے۔

اسلام کی انقلابیت کو فنا کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ لفظ دین سے وہ تمام تصورات نکال لیے جائیں جو کسی طرح انسان کی اجتماعی زندگی میں کوئی ایسی حرکت پیدا کر دیں جو قوت متسلطہ کے لیے سامان تشویش بن جائے۔ اور اس طرح مذہب اور سیاست کے دائرہ ہائے عمل کو بالکل الگ الگ کر دیا جائے۔ محمود غزنوی سے لے کر مغلوں کے زوال تک یہ عمل تفریق مذہب و سیاست بتدریج جاری رہا۔ اس عرصہ میں شعوری یا غیر شعوری طور پر مسلمانوں کی جملہ مساعی علمی، ادبی اور سیاسی (باستثنائے چند جن کا ذکر آگے آئے گا) اسی ایک مقصود کے حصول میں صرف ہوتی رہیں۔ اور ہر مسلمان حکمراں اور ہر دیندار عالم (باستثنائے چند) اسی ایک منزل کی طرف بڑھتا رہا۔ لیکن پہلا شخص جس نے پورے شعور اور ارادہ سے اس منزل کی طرف قدم بڑھایا وہ علاء الدین خلجی تھا۔ خلجی شہنشاہ نے ایک طویل مکالمے کے بعد قاضی مغیث سے برسر اجلاس کہدیا تھا کہ نظری طور پر تم جو چاہے کہو لیکن حکم ہمارا ہی چلے گا۔ یہ کہنا غلط ہو گا کہ علاء الدین نے ارتداد کا ارتکاب کیا تھا۔ اس نے جو کچھ کیا وہ صرف یہ تھا کہ مذہب اور سیاست کے دائرہ ہائے عمل کو الگ الگ کر کے دین اسلام کی انقلابیت پر ایک کاری ضرب لگا دی۔ اس شعوری اور ارادی عمل تفریق کا تکمیلی دور سلطنت مغلیہ کا وہ سنہری زمانہ ہے جس میں شہنشاہ اکبر نے تاریخ کی وہ مشہور و معروف تحریک جاری کی جسے "دین الٰہی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس تحریک کا اصل مقصد ایک ایسی قومیت کی تخلیق تھا جس کے افراد میں رابطۂ باہمی عقیدۂ اسلام کے بجائے کوئی اور عقیدہ ہو اور اسلام کی حیثیت ایک ایسے پرائیویٹ مذہب کی سی رہ جائے جسے اجتماعی زندگی میں کوئی دخل نہ ہو۔ اس تحریک نے ذہنوں پر ایسا پائیدار اثر چھوڑا ہے کہ آج جب اسلام کو ایک انقلابی دعوت کی حیثیت سے سامنے رکھا جاتا ہے تو یہ آواز اتنی اجنبی اور یہ راگ اتنا بے سرا معلوم ہوتا ہے کہ چہرے متغیر ہو جاتے ہیں اور ماتھوں پر شکن پڑنے لگتے ہیں۔ اور کیوں نہ ہو جبکہ پورے ایک ہزار سال تک محراب و منبر سے لے کر تخت طاؤس تک سب اسی لیلائے مقصود کے حصول کی تگ و دو میں مصروف رہے ہوں۔

دین الٰہی مسلمانوں کے موجودہ اجتماعی تصورات میں سے ایک تصور وطنیت اور متحدہ قومیت کا بھی ہے۔ اس

تصور کی بنیاد مذہب و سیاست کی کمل جدائی کے تصور پر رکھی گئی ہے۔ یہ تصور اسپرٹ کے لحاظ سے بہت حد تک اکبر کے "دین الٰہی" کے تصور کی صدائے بازگشت ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اکبری تصور قومیت کے افراد میں رابطہ پیدا کرنے والی چیز اکبر کی ذات تھی اور مسلمانوں کے اس جدید تصور قومیت میں اکبر کی جگہ خاکِ وطن کے تقدس کو کلمۂ جامعہ کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ لہذا اگر اکبر کے "دین الٰہی" کے متعلق کچھ واقفیت حاصل کرلی جائے تو مسلمانوں کے ایک بااثر گروہ کے رجحانات کا نقشہ زیادہ واضح طور پر سامنے آجائے گا۔

اکبر کا واحد مقصدِ حیات استحکام سلطنت

اکبر کی مذہبی حکمتِ عملی اور اس کے "دین الٰہی" کی تاریخی حیثیت پر نظر ڈالنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ معلوم کیا جائے کہ اکبر کے سامنے وہ کونسا مقصدِ حیات تھا جس پر اس کی تمام مساعی مرکوز ہوسکتی تھیں۔ اکبر کو عالمِ صغرسنی ہی میں ایک ایسی سلطنت کی تخت نشینی حاصل ہوئی جسے ابھی ملک میں استحکام نصیب نہیں ہوا تھا۔ بچپن کا زمانہ ہمایوں کے دورِ سیاہ بختی میں کٹا۔ حکومت کے ابتدائی ایام اس کے شیعہ اتالیق بیرم خاں کے زیرِ نگرانی گزرے۔ جب عنان حکومت اپنے ہاتھ میں سنبھالی تو ابھی استحکام کا کام بالکل نامکمل تھا۔ اکبر کو جہاں ایک غیر مستحکم اور متزلزل سلطنت کی وراثت حاصل ہوئی وہیں اُسے اپنے باپ کی ہرزہ گردی اور بے حاصلی کی ساری داستان بھی بطور ایک تلخ یادگار کے ورثہ میں ملی۔ ان حالات نے اس کے دماغ پر گہرا اثر کیا اور اس کے ذہن کو اس جستجو میں لگا دیا کہ وہ ایسے ذرائع اختیار کرے جن سے کہ واقعات ہمایونی کا اعادہ ناممکن ہوجائے۔ سلطنت کی باگ ڈور ہاتھ میں لیتے ہی جو حقیقت اس کے سامنے آئی وہ راجپوتوں کی بڑھتی ہوئی سیاسی امنگ، ہندو عوام کی غیر متغیر اور جامد مذہبیت اور افغان سرداروں کی ہوسِ اقتدار کی سہ رنگی تصویر تھی۔ افغان سردار جو خود مغلوں کی طرح غیر ملکی فاتح کی حیثیت سے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے، استحکام سلطنت کی راہ میں ایک مستقل رکاوٹ تھے۔ اس کے برعکس راجپوتوں کی سیاسی امنگ، جو اپنی قوت کے اظہار کے لیے کسی دائرۂ عمل کی متلاشی تھی، بہت کچھ مفید ہوسکتی تھی۔ لیکن راجپوت مذہبی اور تہذیبی لحاظ سے اس ہندو سوسائٹی کے جزو لاینفک تھے جو کسی قیمت پر بھی تغیر کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ لہذا راجپوتوں کی قوت سے استفادہ کرنے کے لیے لازمی تھا کہ ان کی تہذیب اور معاشرت کو اپنا کر انھیں ممنون ہونے کا موقع دیا جائے۔ اکبر نے یہی راہ اختیار کی۔ اس نے راجپوت نوازی کی پالیسی کو دستور

حکومت میں ایک اہم جگہ دی۔ اور ہر ممکن طریقہ سے اس پالیسی کو کامیاب بنانے میں کوشش وسعی کی۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اسے اس پالیسی میں کافی حد تک کامیابی ہوئی۔ اور مغلیہ سلطنت کی بنیادیں اتنی مضبوط ہوگئیں کہ اکبر کی چوتھی نسل تک اس کی ہیئت حاکمہ میں کوئی تغیر رونما نہ ہوسکا۔ راجپوت نوازی کی پالیسی پر گامزن ہونے کے بعد پے در پے کامیابیوں نے اکبر کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح بٹھادی کہ ایک ایسے اجنبی ملک میں جس کی آبادی کا بیشتر حصہ ایک غیر تغیر پذیر تہذیب ومعاشرت کا حامل ہو، تعمیر واستحکام سلطنت کا صرف یہی ایک طریقہ ہوسکتا ہے کہ حاکم خاندان اپنی غیر ملکی ہیئت کو ملکی تہذیب میں مدغم کرکے اجنبیت کا نشان بالکلیہ محو کر ڈالے۔ اور رعایا اسے نہ صرف اپنے میں سے شمار کرے بلکہ مذہبی عقیدتیں بھی اس سے وابستہ کرلے، یا بالفاظ دیگر تمام طبقوں کو ملاکر ایک متحدہ قومیت پیدا کرنے کی جدوجہد کی جائے۔

متحدہ قومیت کی پیدائش

۱۔ راجپوت رانیاں

اس سلسلے کا سب سے پہلا قدم راجپوت خاندانوں میں ازدواجی تعلقات کی استواری تھا۔ یوں تو اکبر سے پہلے یعنی مسلمان سلاطین کے حرم میں ہندو رانیاں آباد ہوچکی تھیں لیکن اکبری دور میں ان تعلقات کی نوعیت میں ایک بنیادی فرق پیدا ہوا۔ اب ہندو رانیوں کو حرم شاہی میں پورے ازدواجی حقوق واختیارات حاصل تھے۔ وہ مغل حرم میں زیر دست (Underling) کی حیثیت سے نہیں بلکہ گھر کی ملکہ کی حیثیت سے حکمرانی کرتی تھیں۔ انھیں مذہبی عبادات اور معاشرتی رسومات کی ادائیگی میں پوری پوری آزادی حاصل تھی۔ شاہی محلات میں راجپوت رانیوں کے جذبۂ عبودیت کی تسکین کے لیے مندروں کی تعمیر ایک عام بات تھی۔ مغل شہنشاہ ان کے انفرادی معاملات (Personal law) میں قطعاً دخیل نہ ہوتا تھا۔ ان تعلقات سے جہاں راجپوت تلوار مغل کیمپ کی حفاظت میں آئی اور آبادی کے ساتھ چمکنے لگی وہاں شاہی محلات کی ہیئت زندگی کا اثر امرا میں اور ان کی وساطت سے عوام تک پہنچنے لگا اور اس طرح ملکی رعایا کے ذہن سے شاہی خاندان کی اجنبیت کا تصور زائل ہونا ممکن ہوگیا۔

۲۔ عبادت خانہ

متحدہ قومیت کی تخلیق کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ خود اسلام تھا لیکن اکبر کے عہد میں اسلام کی حفاظت جن لوگوں کے سپرد تھی، انھوں نے اسلام کو ایک کلیسائی مذہب بنا کے رکھ دیا جو مذہب وسیاست کی تفریق کا لازمی نتیجہ ہے۔ تاہم یہ کلیسائیت خود بھی ایک رکاوٹ بن سکتی تھی لیکن اکبر

نے استحکام سلطنت کا عمل تہذیبی بنیادوں پر ایسے دور میں شروع کیا جبکہ اطراف عالم میں ہر جگہ کلیسائیت کے خلاف بغاوتیں شروع ہو چکی تھیں۔ یورپ میں لوتھر کی تحریک اصلاح کلیسا نے یورپ کے اقتدار پر کاری ضرب لگا دی تھی۔ ہندوستان میں بھگتی کی تحریک نے جامد ہندویت میں زندگی کے آثار پیدا کر دیے تھے۔ بھگت کبیر اور گرونانک کی تحریکیں اسی زندگی کی مظہر تھیں۔ لہٰذا اسلام کی کلیسائیت سے نجات پانے کے لیے بھی یہ نہایت ہی موزوں وقت تھا۔ اکبر نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اور اپنے مقصد حیات استحکام سلطنت کے لیے ہندی قومیت کی تخلیق کا کام پوری سرگرمی سے شروع کر دیا۔ اکبر ایک اَن پڑھ انسان تھا۔ اس کی ابتدائی دلچسپی صرف توسیع واستحکام سلطنت سے تھی لیکن رفتہ رفتہ اسے یہ بھی شوق ہوا کہ وہ ان مختلف مذاہب کا مطالعہ کرے جن کی بنا پر بظاہر انسانیت کے اندر اتنے واضح حدود و امتیاز قائم ہو گئے تھے۔ عبادت خانہ[1] کی تعمیر اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی۔ اس عبادت خانہ میں مسلمان مُلّا، ہندو برہمن، جینی پیشوا، عیسائی پادری اور زرتشتی عالم سب آ کر بحث مباحثہ میں حصہ لیتے اور اپنے اپنے مذاہب کی صداقت اور خوبیوں پر اور دوسرے مذاہب کے نقائص پر دھواں دھار تقریریں کرتے تھے۔ عبادت خانہ کے بحث و جدل کا اثر اکبر کے دماغ پر صرف اتنا ہی ہوا کہ وہ کسی ایک مذہب پر بھی پختہ نہ رہا۔ ایک اَن پڑھ بادشاہ جس کا واحد مقصد زندگی سلطنت کی توسیع و استحکام ہو کم ظرف، خوشامدی اور جھگڑالو ملاؤں کے لفظی مناظروں اور منطقی مجادلوں سے اس کے سوا اور کوئی اثر لے بھی کیا سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب سے بے پروائی کا رجحان اس کا اور زیادہ ترقی کر گیا۔ اور علماء سے جن کا پول عبادت خانہ میں اچھی طرح کھل گیا تھا، وہ بالکل بے نیاز ہو گیا۔ متحدہ قومیت کے عمل تخلیق کو تیز تر کر دیا گیا۔ ہر وہ فعل جس سے غیر ملکی مسلمانوں کی برتری یا اجنبیت اور ملکی ہندوؤں کی کمتری یا غیریت کا اظہار ہوتا ہو بتدریج ختم کر دیا گیا۔ پبلک سروس کے دروازے، جو اس سے پہلے بیشتر حاکم طبقہ کا اجارہ شمار ہوتی تھی، ملکی ہندوؤں کے لیے کھول دیے گئے اور ان کو اونچے اونچے مناصب عطا کیے گئے۔ ان کے دلوں کو رام کرنے کے لیے جگہ جگہ مندر تعمیر کروائے گئے۔ جزیہ جو اسلامی نظام کے اضمحلال کی وجہ سے ہندوؤں کے ہاں محض نشان ذلت بن گیا تھا، منسوخ کر دیا گیا۔

---

[1] یہ کوئی عبادت کی جگہ نہ تھی بلکہ مذاہب کے متعلق بحث مباحثہ (Debating hall) کی جگہ تھی۔

۳۔ ہندی تمدن کو اپنانے کی کوشش | جو فضا محلات شاہی میں بالفعل قائم ہو چکی تھی اور جس کا ذہنی پس منظر عبادت خانہ میں تیار کیا جا رہا تھا اسے اب تمام سلطنت میں پھیلانا شروع کر دیا گیا۔ اور اس کی صورت یہ اختیار کی گئی کہ ہندوؤں کے تہذیبی اور ثقافتی شعاروں کو اپنانے اور غیر ہندی تہذیب کے شعاروں کو مٹانے کے لیے بتدریج بہت سے قوانین وضع کیے گئے۔ مثلاً گائے کے گوشت کے استعمال کی ممانعت کر دی گئی۔ اور گوشت خوری کی عام طور پر حوصلہ شکنی کی گئی۔ ریشمی لباس اور طلائی زیورات کے استعمال کو فروغ دیا گیا۔ خالص اسلامی ناموں کے بجائے ملے جلے ہندی نام رکھے جانے لگے۔ ڈاڑھیاں صاف ہو گئیں۔ کبھی کبھی قربانی بند کر دی گئی۔ الغرض ہر ممکن کوشش کی گئی کہ معاشرتی معاملات میں اکثریت کی تہذیب کو خاص مراعات دی جائیں اور پھر اس تہذیب کو مغل تہذیب سے ممزوج کر کے ایک نئی تہذیب پیدا کی جائے جو صورت اور معنی ہر لحاظ سے خالص ہندی نژاد نظر آئے۔[له]

متحدہ قومیت کے لیے آخری اور منظم کوشش۔ دینِ الٰہی | اس مرحلہ پر پہنچ کر اکبر نے محسوس کیا کہ اسے اپنی پالیسی میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ہے اور کہ اس وقت کوئی ایسی منظم طاقت موجود نہیں ہے جو اس پالیسی کے خلاف کامیاب مزاحمت کھڑی کر سکے۔ نیز حدود سلطنت کی وسعت اور سیاسی حریفوں کے مقابل میں اس کی پیہم فتوحات نے اسے اپنی پالیسی کی صحت کا کامل یقین دکھایا۔ لہٰذا اسے اب یہ خیال ہوا کہ جو کام اس نے جاری کیا ہے وہ آگے رکنے نہ پائے بلکہ ہمیشہ کے لیے کسی نہ کسی طرح سلطنت کی بنیادوں کو تقویت پہنچاتا رہے۔ اس مقصد کے لیے اسے دو نہایت ہی موزوں آدمی مل گئے جنھوں نے اکبری تحریک کے لیے علمی اور فکری بنیادیں مہیا کر کے اسے ایک منظم ادارے کی شکل دے دی۔ شیخ مبارک اور اس کا لائق بیٹا ابوالفضل اپنے دور کے بہترین عالم اور مسلّمہ ادیب تھے۔ ان کا علم بے پایاں، ان کی نظر دور رس اور ان کا قلم بے نظیر تھا۔ یہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اکبری طرزِ عمل بالآخر ایک مستقل فلسفے کی صورت میں نمودار ہوا جسے تاریخ میں 'دینِ الٰہی' یا 'توحیدِ الٰہی' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اکثر مورخین "دینِ الٰہی" کو اسلام اور عیسائیت کی طرح ایک مذہب کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ ایک نیا مذہب تھا جو اکبر نے محض طاقت کے نشے میں اپنی خدائی کا سکہ بٹھانے کے لیے جاری کیا تھا۔

له یہ تمام واقعات اکبری عہد کے مشہور مورخ ملا عبدالقادر بدایونی کی کتاب منتخب التواریخ میں مندرج ہیں اور کئی دوسرے ذرائع سے ان کی تصدیق ہو چکی ہے۔

اور جیسا کہ آخر تک اس کی کوشش رہی کر رہ گیا۔ سر وولزلے ہیگ (Sir W. Haig) اور سمتھ (Smith) اسی طرح کا خیال رکھتے ہیں۔ لیکن دین الٰہی کا اگر مطالعہ اس سے زیادہ اہم حقیقتوں کو سامنے لاتا ہے۔ قبل اس کے کہ اس پر غور کیا جائے کہ دین الٰہی ایک مستقل مذہب تھا یا نہیں، یہ حقیقت اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ دین الٰہی اکبر کی زندگی کا کوئی اتفاقی حادثہ نہیں تھا جو غیر متوقع حصولِ طاقت کی وجہ سے اکبر کے دماغ میں فوری طور پر موجود ہوا ہو۔ بلکہ یہ ایک مسلسل و مربوط پالیسی کی ارتقائی منزل تھی۔ ابتدا ہی سے اکبر اس کوشش میں مصروف ہو گیا تھا کہ وہ ہندو مسلم اختلاطات سے ایک ایسی تہذیبی قومیت پیدا کرے جو استحکام سلطنت کے لیے مضبوط بنیاد کا کام دے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس کی توجہ دو چیزوں کی طرف منعطف ہوئی۔ اول یہ کہ اسٹیٹ کو بجائے خالص مذہبی سٹیٹ ہونے کے قریباً ایسا اسٹیٹ بنا دیا جائے جس میں کسی خاص مذہب کو کوئی اقتدار (Authority) حاصل نہ ہو اور جس میں کسی خاص مذہبی گروہ کو ترجیحی سلوک کا مستحق نہ ٹھیرایا جائے۔ یعنی وہ بالفعل ایک لادینی (Secular) اسٹیٹ بن جائے۔ دوم یہ کہ رعایا کے دلوں میں حاکم خاندان کے لیے گہری عقیدت پیدا کر دی جائے۔ اول الذکر مقصد کا حصول صرف ایک ہی طریقے سے ممکن تھا اور وہ یہ کہ مذہب کے نمائندوں کی طاقت کو بالکل ختم کر دیا جائے۔ اور دین اور دنیوی حکومت کے متعلق جملہ اختیارات بادشاہ کی ذات ہی میں مرکوز کر دیے جائیں۔ چنانچہ ۱۵۷۹ء کا مشہور اعلان عصمت (Infallibility Decree) اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی تھی۔ اس اعلان کے ذریعہ جملہ معاملات میں، خواہ دنیوی ہوں خواہ دینی، بادشاہ کا فیصلہ آخری اور ناطق قرار دیا گیا اور مخدوم الملک، ملا عبد النبی اور دیگر علما نے خود اپنے ہاتھوں سے اس دستاویز پر دستخط ثبت کیے۔ جس منزل کی طرف اکبر تدریجاً بڑھ رہا تھا یہ اعلان اس راہ کا ایک اہم نشان ثابت ہوا۔ چنانچہ اس اعلان کے چند ہی سال بعد اُس نے دین الٰہی کی بنیاد رکھ دی۔

اکبری دور تاریخ میں تقدسِ مذہب کا دور تھا۔ اس دور میں کسی ایسی سوسائٹی کا تصور بھی محال تھا جو بالکل لامذہبیہ (Irreligious) ہو اور جس کی اجتماعی زندگی سے مذہب بحیثیت ایک عنصر غالب کے بالکل خارج ہو چکا ہو۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس دور کا ذہن کسی ایسے طرزِ فکر سے آشنا ہی نہ تھا جس میں

مذہب اور تصوف کسی نہ کسی صورت میں کارفرما نہ ہوں۔ اور یہ صورت حال کچھ مشرقی ممالک سے ہی مخصوص نہ تھی بلکہ اس وقت کی معلوم دنیا میں ہر جگہ یہی چیز پائی جاتی تھی۔ اس لیے اگر کوئی نظام حکومت اس دور میں یہ حیثیت حاصل کرلے کہ وہ کسی خاص رائج الوقت مذہب کے اقتدار سے آزاد ہوجائے اور یہ مقصود متواتر اور پیہم سعی و جہد سے حاصل کیا گیا ہو تو وہ بالفعل اپنے وقت کا لادینی (Seculer) نظام حکومت متصور ہونا چاہیے۔ آجکل جبکہ لادینیت خود ایک مستقل ادارہ بن چکا ہے، اکثر ممالک آئینی طور پر کسی نہ کسی مذہب کا اقتدار ضرور تسلیم کرتے ہیں۔ مگر ہم انھیں کبھی بھی مذہبی ریاست تصور نہیں کرتے کیونکہ بالفعل ان کی اجتماعی زندگی کا سارا کاروبار لادینی بنیادوں پر چلایا جاتا ہے۔ اکبر کی مذہبی پالیسی بھی اسی دھارے پر بہہ رہی تھی۔ ریاستی نظام کو بالفعل لادینی بنا دیا گیا تھا۔ اگرچہ ذاتی طور پر اکبر کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ یک قلم مذہب سے بھی آزاد ہوجائے کیونکہ یہ چیز اس دور کی سپرٹ کے منافی تھی۔ علاوہ ازیں اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اکبر کی روح میں مذہب کے لیے اضطراب ضرور پایا جاتا تھا۔ وہ کئی دفعہ خلوت میں بیٹھ کر تن تنہا مسئلہ کون و مکان کو حل کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا لیکن اَن پڑھ ہونے کی وجہ سے وہ خود کسی علمی تحقیق کا اہل نہیں تھا۔ اور جو لوگ علم کے اجارہ دار تھے ان میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ اسلام کی اصل حقیقت کو خود پاسکیں چہ جائے کہ ایک ذکی اور ہشیار بادشاہ کے دل میں اسے اتار سکیں۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے صاحبِ منتخب التواریخ کے حوالے سے اکبری دور کے علما کی حالت کا نقشہ ذیل کے الفاظ میں کھینچا ہے:۔

"علما اور فقہا نے صرف فقہ کو تمام علم دین خیال کرلیا تھا اور قرآن اور حدیث سے جو اسلام کا حقیقی سرچشمہ ہیں، تشبث و استنباط کرنا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ بس اسلام کا صرف فقہی نقطۂ نظر باقی رہ گیا تھا۔ روح اسلام فنا ہوگئی تھی۔ اکثر علما مخدوم الملک کی طرح تھے جو ادائیگی زکوٰۃ سے بچنے کے لیے سال کے آخر میں اپنی تمام جائداد اپنی بیوی کے نام منتقل کردیتا تھا اور سال آئندہ پوری مدت گذرنے سے پہلے پھر واپس لے لیتا علما مسائل فقہ کی موشگافیوں میں منہمک رہتے تھے اور معمولی سے معمولی اختلافات سخت جھگڑے پیدا کرنے کے لیے کافی ہوتے تھے۔ وہ جاہ پرست تھے اور ہمیشہ دنیاوی اقتدار حاصل کرنے کی سعی میں مصروف رہتے تھے۔ انھیں ہمیشہ ایسے فتووں کے لیے آمادہ کیا جاسکتا تھا جس کی رو سے حرام کو حلال اور حلال کو

حرام قرار دیا جا سکے"۔ صفحہ ۱۹۹-۲۰۰ (اسی چیز کا نام کلیسائیت ہے)

الغرض اکبر نے نظامِ حکومت کو ایک مذہب کے اقتدار سے آزاد کر کے وقت کی رَو کے مطابق ایک دوسرے تصورِ مذہب کے ماتحت کرنا چاہا۔ لیکن جب اس نئے تصورِ مذہب کا صحیح تجزیہ کیا جاتا ہے، تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض ایک ایسا ادارہ تھا جو مشترکہ تہذیب اور متحدہ قومیت کے تصورات کو مذہبی جواز مہیا کرنے کے لیے وجود میں لایا گیا تھا۔

بایں ہمہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ 'دینِ الٰہی' مذہب کے مشہور معنوں میں کوئی مذہب نہیں تھا۔ اس مذہب کی نہ تو کوئی خاص کتاب تھی، نہ اس کے باضابطہ مبلغ تھے، نہ اس کا کوئی خاص طریقِ عبادت تھا اور نہ ہی یہ اس کے پیغمبر (اکبر) کا اصلی مقصدِ حیات تھا۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ اس میں شامل ہونے والوں کو چند چیزیں اختیار کرنی پڑتی تھیں جن میں سے اکثر پہلے سے ہی شاہی حلقوں میں رائج تھیں۔ سب سے ضروری چیز بادشاہ کی ذات سے مذہبی عقیدت تھی۔ اسی عقیدت کے لحاظ سے ان کے درجے مقرر کیے جاتے تھے۔ درجہ اول میں وہ لوگ ہوتے تھے جو مال، جان، عزت اور مذہب یہ چاروں چیزیں بادشاہ کی خاطر قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتے۔ اس کے بعد وہ لوگ آتے تھے جو علی الترتیب تین، دو یا ایک چیز قربان کرنے کے لیے تیار ہوتے تھے۔ دینِ الٰہی میں شامل ہونے والے آپس میں ملتے وقت اللہ اکبر اور جل جلالہ کے الفاظ سے تسلیمات ادا کرتے تھے۔ (یاد رہے کہ اکبر کا نام جلال الدین تھا)۔ اسی طرح ہر رکن کو اپنے جنم دن پر ایک پر تکلف دعوت کا انتظام کرنا پڑتا تھا۔ گوشت خوری کے متعلق ایک خاص ضابطے کی پابندی بھی اس کے لیے لازم ہوتی تھی۔[۱]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ دینِ الٰہی جہاں اکبر کے اضطرابِ روحانی کے لیے سامانِ تسکین تھا وہاں اس کا مرکزی مقصد بادشاہ کی ذات سے گہری مذہبی عقیدت پیدا کرنا اور اس کے ان احکام اور خواہشات کی پوری پوری پابندی کرنا تھا جن کی تنفیذ سے وہ تہذیب پروان چڑھتی تھی جسے اکبر استحکامِ سلطنت کے لیے ضروری خیال کرتا تھا۔ اس لحاظ سے 'دینِ الٰہی' کسی مذہب کے بجائے ایک تہذیبی ادارہ معلوم ہوتا ہے۔ جس کے اراکین از خود بلا جبر و اکراہ اس ادارہ میں داخل یا اس سے خارج ہوتے تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے

---

[۱] آئینِ اکبری صفحہ ۱۹۵-۱۹۷

اکبر نے دینِ الٰہی کی ترویج و اشاعت کے لیے کبھی کوئی سرگرمی نہیں دکھائی۔ غالباً تاریخِ مذاہب میں یہ ایک واحد مذہب ہے جس کا بانی اس کے متعلق بہت زیادہ سرگرم یا مضطرب نہیں نظر آتا۔ اکبر نے دینِ الٰہی میں عدم شمولیت کو کبھی کسی کے منصب اور مرتبہ پر اثر انداز نہیں ہونے دیا۔ اسی لیے اس میں شامل ہونے والوں کی تعداد ہمیشہ مختصر رہی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ درباری خوشامدیوں نے بادشاہ کے طرزِ عمل کے لیے وجہ جواز مہیا کر کے اس کی عنایات کے لیے مرکزِ توجہ بننے کا بہترین طریقہ پایا، تاکہ اس نظام (Order) میں شامل ہو جائیں اور بس![1]

دینِ الٰہی خواہ ایک مستقل مذہب ہو خواہ ایک تہذیبی اخوت، اس کا بنیادی تخیل یہ تھا کہ ہر مذہب میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور موجود ہے۔ لہٰذا تمام مذاہب میں سے عالمگیر سچائیاں لے کر ان کی بنیاد پر سوسائٹی کی تعمیر کرنی چاہیے۔ دینِ الٰہی کے ضابطہ میں اسلام کا عقیدۂ توحید، جین مت کا اصول اہنسا، ہندو مت کی پرستشِ آفتاب اور پارسیوں کا طریقۂ آتش پرستی سب ایک معجونِ مرکب کی شکل میں شامل تھے۔ اکبر نے اپنے زعم میں صلح کل اور رواداری کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے ایک ایسا مرکب تیار کیا تھا جو سب کی طبیعت کو راس آ جائے۔ اور حق یہ ہے کہ ایک ناخواندہ مفکر جو عزم و ثبات اور طاقت و حکومت کے ساتھ ایک واضح نصب العین رکھتا ہو، یہی کچھ کر سکتا تھا۔ بلکہ اکبر کی ذہانت کی داد نہ دینا ظلم ہوگا۔ اس نے ہندوستان جیسے ملک میں جہاں حاکم و محکوم کے درمیان تہذیبی لحاظ سے ایک وسیع خلیج حائل تھی محض استحکامِ سلطنت کے لیے ایک ایسی مشترک اور جامع تہذیب پیدا کرنے کی کوشش کی جس کا نتیجہ ایک متحدہ قومیت کی شکل میں نمودار ہو۔ اور یہ وہ چیز ہے جو صدیوں پیشتر حاصل کر لی اور دنیا باوجود انتہائی کوشش کے اس کو اب تک نہ حاصل کر سکی۔ چنانچہ اکبر کا سب سے بڑا مورخ سمتھ (Smith) ایک دوسرے ذمہ دار آدمی کی رائے یوں نقل کرتا ہے:

"اکبر نے خیال کیا کہ ایک ایسی سلطنت کے لیے جس کی باگ ڈور شخص واحد کے ہاتھ میں ہو،

[1] مغلوں کی مذہبی حکمت عملی پر بحث کرتے ہوئے پروفیسر سری رام شرما نے اپنی کتاب (The Religious Policy of The Mughal Emperors) میں دینِ الٰہی کو زیادہ سے زیادہ ایک اخوت (Brotherhood) کا درجہ دیا ہے۔

یہ بات صد درجہ ہلاکت انگیز ہے کہ اس کی رعایا آپس میں پھٹ پڑی اور ایک دوسرے کی مخالف ہو ....

.... لہٰذا اسے چاہیے کہ وہ ان سب کو ایک وحدت میں پرو ڈالے لیکن یہ عملی وحدت اس صورت میں سرانجام پائے کہ وہ فی الواقع "ایک" میں "سب" اور "سب" میں "ایک" کا رنگ پیدا کر دیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی پیش نظر ہے کہ جس مذہب میں جو عمدگی ہے وہ ضائع نہ ہونے پائے اور جو خوبی جس میں ہے وہ حاصل کر لی جائے۔ اس طرح خدا کی توقیر و عزت کا سکہ بیٹھ جائے گا۔ لوگ امن و چین کی زندگی بسر کرنے لگیں گے اور سلطنت مامون و محفوظ ہو جائے گی۔[۵۵] لیکن ان سب باتوں کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ اکبر کا مقصد دینی محض استحکام سلطنت تھا اور بس:

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے "دین الٰہی" اکبر بادشاہ کی ان تخلیقی قوتوں کی یادگار ہے جن سے کام لے کر وہ ایک ایسی قومیت کی تعمیر کرنا چاہتا تھا جس کے افراد میں رابطہ باہمی اسلام نہ ہو، کچھ اور ہو۔ اور اس کی صورت صرف یہی ہو سکتی تھی کہ اس نئی قومیت میں دین کا صرف وہی تصور رائج کیا جائے جو اجتماعی زندگی میں کسی انقلابی دعوت کا سبب نہ بن سکے اور جس میں اصول اور مسلک کا کوئی سوال نہ ہو بلکہ اس میں دین سے مراد افراد کی "روحانی تسکین" کے لیے پوجا پاٹ کے چند مراسم اور معاشرتی برتاؤ کے لیے چند اخلاقی اصول قرار پائیں۔ اکبر کے لیے یہ تصور دین بہت مفید تھا کیونکہ کشور کشائی کے لیے عموماً اور ہندوستان جیسے ملک میں استحکام سلطنت کے لیے خصوصاً اس سے بہتر اور زیادہ کارگر نسخہ کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا اس نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے اس نسخے کو خوب استعمال کیا۔ لیکن اس سے یہ حقیقت نہیں بدل سکتی کہ اکبر کی حکمت عملی اس کی خود غرضانہ خواہش اقتدار کے لیے جتنی مفید تھی، اس سے کئی گنا زیادہ اسلام کے لیے مضر تھی۔ چنانچہ جن خیالات کا بیج ہندوستان کے اجتماعی ذہن میں سولھویں صدی میں ڈالا گیا تھا وہ آج پورے چار سو سال گزر جانے کے بعد بھی پھل دیئے جا رہا ہے، اور انتہا یہ ہے کہ بڑے بڑے علماء و فضلا اس وقت بھی اپنی تمامتر مساعی اسی پودے کی آبیاری میں صرف کر رہے ہیں۔

تحریک اسلام | یہ ازل سے خدا کی سنت چلی آ رہی ہے کہ جب اقتدار و حکومت صراط مستقیم سے ہٹ کر گمراہی

Bartoli cited by Smith in Akber the Great mogha! P. 211-12. ۵۵

یہاں یہ بھی ظاہر ہے کہ عمل یک رنگی میں صرف اسی تہذیب کا رنگ غالب ہو سکتا ہے جس کے علمبرداروں کی تعداد زیادہ ہو۔

اور ضلالت کی وادیوں میں کفر وطغیان کے پھریرے اڑانے لگتے ہیں تو اسی گمراہ سوسائٹی میں سے ایسے خدا کے بندے پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں جنھیں حقیقت نفس الامری کا پورا ادراک حاصل ہو جاتا ہے اور وہ پورے جوش وانہماک سے لوگوں کو صراط مستقیم کی طرف دعوت دینے لگ جاتے ہیں۔ وہ اپنی تجدیدی مساعی سے دین و مذہب کے تصورات سے سارے کھوٹوں کو نکال دیتے ہیں اور اصل حقیقت کو تہذیب ومعاشرت اور رسم ورواج کے تمام جاہلانہ پردوں سے باہر نکال کر لوگوں کی آنکھوں کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ اس طرح نسل، وطن، تہذیب اور دیگر مقاصد کے بجائے دین اور صرف دین ہی دعوت وتنظیم کی بنیاد، اور اجتماعی حرکات کا کعبہ مقصود بن جاتا ہے۔ چنانچہ جب شاہی اقتدار، عالمانہ خوشامد اور عوامی جہالت کے باہمی گٹھ جوڑ سے اکبری تحریک کو کامیابی نصیب ہونا شروع ہو گئی تو سنت الٰہی کے مطابق اسی ماحول میں سے ایک ایسی شخصیت اٹھی جو صفائے ذہنی، پاکدلی اور بالغ نظری کا مجموعہ کمالات تھی۔ اس نے جاہلیت کے توبرتو پردوں کے اندر سے اسلام کی اصلی تصویر کو دیکھ لیا۔ اور پھر اپنی پوری ہمت اس بات پر صرف کر دی کہ ان پردوں کو ہٹا کر اس تصویر کو دنیا کی آنکھوں کے سامنے لے آئے۔ وہ علم کا دریا اور عزم کا پہاڑ جہانگیر کے طوق وسلاسل، علماء ومشائخ کے فتاویٰ اور امراء کی خوشامد پرستی کسی چیز کو بھی خاطر میں نہ لایا اور ہندوستان میں عربوں کے بعد پہلی دفعہ اسلام کو ایک ہمہ گیر دعوت کی حیثیت سے پیش کرنے لگا۔ یہ شخصیت کون تھی؟ شیخ احمد سرہندی! الملقب بہ مجدد الف ثانی! شیخ موصوف نے اپنی دعوت کو اس عمدگی سے پیش کیا اور اپنے مشن کو اس کامیابی سے پورا کیا کہ جو شمع ہدایت ایک دفعہ جلا دی گئی تھی وہ صرصر کے تھپیڑوں اور خزاں کے جھونکوں سے نہ بجھ سکی۔ یہ وہی شمع تھی جس کی ضیا پاشی نے بعد میں شاہ ولی اللہ جیسے آفتاب علم وہدایت کو منور کیا اور سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کو ایک ایسی تحریک کا علمبردار بنایا جس کی نطیر ہندوستان کی ساری تاریخ مسلمین میں نہیں ملتی۔ یہی وہ تحریک ہے جس کے قائدین اور سپاہیوں نے نفسانی آلائشوں سے پاک ہو کر محض خدائی نظام زندگی کو دنیا میں قائم کرنے کے لیے گھربار، مال ودولت اور جاہ وحشمت سب پر لات مار دی۔ یہی وہ تحریک ہے جس کے علمبرداروں نے وطن سے کوسوں دور اجنبی علاقوں میں، کشور کشائی اور ملک رانی کے لیے نہیں، بلکہ محض اقامت دین کے لیے مصائب اور تکالیف کا ایسا مردانہ وار مقابلہ کیا جس کی سرگزشت سے تاریخ کے صفحات ہمیشہ نورانی رہیں گے۔ یہی وہ تحریک ہے جس کے زعما، وقائدین کا مقصد وحید

ظلم و طغیان کو دنیا سے مٹا کر حق و عدل کے اسلامی تصورات پر ایک جہان نو کی تعمیر کرنا تھا۔ اگرچہ بعض اسباب سے یہ تحریک حوادث زمانہ کا شکار ہو کر رہ گئی۔ تاہم آج بھی جبکہ مغربی استیلا نے مسلمانوں کے افکار و خیالات اور حرکات و عمل کو بالکل نئی شاہراہ پر ڈال دیا ہے، اس کی بازگشت کسی کسی گوشہ سے سنائی دے جاتی ہے۔

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، مسلمانوں میں اس وقت دو قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو دانستہ یا نادانستہ ایسی متحدہ قومیت کی تعمیر میں اپنی قوتیں صرف کر رہے ہیں جس کی بنیاد اشتراک وطن پر ہو اور دوسرے وہ ہیں جو مغربی تصور قومیت کے زیر اثر حاکمیت قومی کی بنیاد پر اپنی اجتماعی زندگی کی عمارت اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اول الذکر گروہ کی صحیح پوزیشن سمجھنے کے لیے اکبر کے 'دین الٰہی' کا مختصر سا تجزیہ کیا گیا ہے کیونکہ معنوی لحاظ سے اکبری دین الٰہی اور متحدہ قومیت کا موجودہ نصب العین ایک ہی چیز ہے۔ اب دوسرے گروہ کا موقف معلوم کرنے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سید احمد شہید کی تحریک پر بھی ایک سرسری نگاہ ڈال کر معلوم کیا جائے کہ اس کا اصل مقصد کیا تھا اور موجودہ مسلم قومی تحریک کہاں تک اس تحریک سے متعلق ہو سکتی ہے۔

تحریک اقامت دین

ہندوستان کی تاریخ میں اٹھارہویں صدی کا آغاز اس لحاظ سے خاص طور پر توجہ کے قابل ہے کہ اس دور میں ایک ایسی عظیم الشان سلطنت کی بنیادیں متزلزل ہونے والی تھیں جس نے ڈیڑھ صدی سے اوپر تک ہندوستان کے ایک کونہ سے دوسرے کونے تک اناولاغیری کا سکہ بٹھا کر ملک کی تاریخ میں ہمیشہ کے لیے مستقل جگہ حاصل کر لی تھی۔ مگر جس کی شان و شوکت تھوڑے ہی عرصہ میں خاک میں ملنے والی تھی۔ خاندان مغلیہ کے آخری اولوالعزم بادشاہ، اور اکبر بادشاہ کے پڑپوتے اورنگ زیب عالمگیر نے ۱۱۱۸ھ میں آنکھیں بند کر لیں۔ عالمگیر کے فوت ہوتے ہی طوائف الملوکی کا وہ سلسلہ شروع ہو گیا جس نے نصف صدی گزرنے سے پہلے پہلے نظام حکومت کا تمام شیرازہ بکھیر دیا۔ اور ملک میں کئی اندرونی اور بیرونی طاقتوں میں آپس میں نبرد آزمائی ہونے لگ گئی۔ اس سیاسی انتشار کا لازمی نتیجہ ہوا کہ ہندوستان کی مسلم سوسائٹی ہر قسم کی علمی، فکری اور اخلاقی بیماریوں کا شکار ہو گئی۔ نفسانی اغراض اور گھٹیا درجے کے مقاصد زندگیوں کے نصب العین بن گئے۔ تاجداروں سے لے کر بھٹیاروں تک سب خواہشات نفسانی کے غلام اور پیٹ کے بندے ہو گئے۔

شعر و ادب، وہاں کا سارا زور طبیعت اصحاب جاہ کی تعریف اور مخالفوں کی ہجو پر صرف ہونے لگا اور چند پامال شدہ خیالات کی دہرائی و تدریس کا نام علم رکھ دیا گیا۔ ایسی تاریک فضا میں کسی صاحب فکر آدمی کا پیدا ہونا بظاہر مستبعد معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ ایسی تاریکی میں ایک ستارہ نکلا جو اتنی درخشانی سے چمکا کہ غروب ہو جانے کے بعد بھی پختہ ہستی کا اثر چھوڑ گیا۔ یہ ستارہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۱۱۴ھ - ۱۱۷۶ھ) تھے۔ شاہ صاحب اسی ماحول اور اسی سوسائٹی سے ابھرتے ہیں لیکن ان کا ذہن اپنے ماحول سے بالکل متاثر نہیں ہوتا۔ وہ علوم دینیہ میں بالکل ایک نئی طرز تحقیق و اجتہاد کی طرح ڈالتے ہیں۔ اور مذہب کو اوہام و خرافات کے پردوں سے نکال کر خالص علمی و عقلی معیار پر پرکھنے کے قواعد وضع کرتے ہیں۔ مذہب کا یہ علمی اور عقلی مطالعہ انھیں بالآخر اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ انسانیت کی جملہ اجتماعی اور انفرادی بیماریوں کا واحد علاج صرف اس بات میں مضمر ہے کہ تمام مروجہ نظامہائے زندگی کو توڑ کر صرف اسلامی نظام زندگی کو قائم کیا جائے اور انسانی زندگی کے جملہ شعبوں کی تعمیر تمام بنیادوں کو ڈھا کر صرف اسلام کی بنیادوں پر کی جائے۔[1] شاہ صاحبؒ ان انقلابی افکار کو صرف کتابی صورت میں مدون کر کے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا بلکہ اپنے مدرسہ میں ان کی باقاعدہ تدریس بھی شروع کر دی۔ اس طرح یہ طرز فکر ایک علمی تحریک کا محرک اور پیش خیمہ بن گیا۔ شاہ صاحب خود ۱۱۷۶ھ میں انتقال فرما گئے لیکن ان کا مدرسہ شاہ عبدالعزیز صاحب (۱۱۵۹ھ - ۱۲۳۹ھ) کے زیر اہتمام تعلیم و تعلّم کا کام انھی اصولوں پر کرتا رہا جن کو شاہ صاحب مدوّن فرما گئے تھے۔ یہ سلسلہ درس و تدریس رنگ لائے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ ولی اللّٰہی افکار و خیالات کا حلقہ اثر وسعت اختیار کرنے لگا، اور اذہان و قلوب میں اسلام کا صحیح تصور پیوست ہونے لگا تو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں ہل چل شروع ہو گئی۔ یہ افکار مدرسہ کے حدود سے نکل کر سوسائٹی تک پہنچنے لگے۔ مسجدوں اور شاہراہوں میں یہ اجنبی صدائیں سنی جانے لگیں۔ رسم و رواج اور اوہام و خرافات پر جو کہ اصل دین کی جگہ لے چکے تھے، چوٹیں پڑنے لگیں۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ اسماعیل شہید نے جامع مسجد کی بڑی مجلسوں میں علی الاعلان اپنے خیالات کو پیش کرنا شروع کر دیا۔ ہر طرف ہنگامہ برپا ہو گیا۔ صدیوں کا جمود ٹوٹنے لگا اور مذہب کے غلط تصورات کا طلسم پاش پاش ہو کر رہ گیا۔ لیکن سنت الٰہی کے

[1] فکِّ کُلِّ نظام۔ (فیوض الحرمین ص ۸۹)

مطابق اعلاءِ کلمۃ اللہ کی یہ دعوت اپنا ردعمل اپنے ساتھ لائی۔ اسلام کے "کلیسائی" حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔ علما، و مشائخ کو مسندوں اور خانقاہوں کی فکر پڑ گئی۔ امراء اور وزرا کو اپنی شان و شوکت خطرے میں نظر آنے لگی۔ اور حفظ ما تقدم کی خاطر ہر طرف سے سخت مزاحمت شروع ہو گئی۔ مگر شاہ شہید ایسی مزاحمتوں کو خاطر میں لانے والے نہیں تھے۔ انھوں نے اپنا کام جاری رکھا تا آنکہ سوسائٹی کا صالح عنصر چھٹ کر باہر آنے لگا اور مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت تیار ہو گئی جس کے سامنے دین حق کے سوا کوئی اور مقصد نہیں تھا یہی جماعت تھی جس نے بالآخر سید احمد بریلوی کے زیر قیادت اقامت دین کے لیے اجتماعی حرکت جاری کی اور جہاد و قتال سے اس نظام کو عملاً قائم کرنے کی کوشش کی جس کا خواب شاہ ولی اللہ دیکھ گئے تھے۔

۱۸۱۶ء سے ۱۸۲۴ء تک جماعت کے عملی پروگرام کے اہم عنوان اشاعت مقصد، تشکیل جماعت اور فراہمی قوت رہے۔ اور ان مقاصد کے حصول کے لیے پورے آٹھ سال تک تحریر و تقریر، تعارف و ملاقات اور ملک کے طول و عرض میں دوروں کا سلسلہ جاری رہا۔ اسی عرصہ میں حج بیت اللہ کا فریضہ بھی ادا کیا گیا۔ ۱۸۲۴ء میں جب یہ محسوس کیا گیا کہ اتنی قوت فراہم ہو چکی ہے اور جماعت کی تنظیم اس حد تک مضبوط ہو گئی ہے کہ کوئی عملی قدم اٹھا دیا جائے تو باقاعدہ جہاد کا اعلان کر دیا گیا۔ لیکن قائدین تحریک نے ہندوستان کے ماحول کو کسی عملی اقدام کے لیے سازگار نہ پا کر یہ فیصلہ کیا کہ کسی ایسے دائرۂ ہجرت کی تلاش کی جائے جہاں اقامت دین کے لیے عسکری مہمات شروع کرنے کے لیے ایک مستقل مرکز ہاتھ آ سکے۔ چنانچہ ۱۸۲۶ء میں یہ اسلامی جماعت دہلی سے سرحد کو روانہ ہوئی۔ جہاں اس نے قبائلی مسلمانوں کو اپنے مقصد سے متعارف کر کے اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ آخر کچھ کشمکش کے بعد جنوری ۱۸۲۷ء میں بمقام ہنڈ (اٹک سے ۱۵ میل اور پشاور سے ۴۰ میل) سید احمد رحمۃ اللہ علیہ کی امامت کا اعلان کر دیا گیا اور ان کی قیادت میں حکومت الٰہی قائم کر دی گئی مقبوضہ علاقوں میں قوانین شرعیہ کا اجرا ہونے لگا۔ مجرموں کو حدیں لگائی جانے لگیں۔ اراضی کا لگان بحساب عشر وصول ہونے لگا۔ شرعی قاضی مقدمات کے فیصلہ کے لیے مقرر ہوئے۔ اور فرائض دینی کی پابندی کا باقاعدہ احتساب مقرر کر دیا گیا۔ لیکن حکومت الٰہی کا قیام تمام باطل قوتوں کے لیے اعلان موت تھا۔ وہ مطلق العنان اور بے لگام مسلمان سردار جو مسند ریاست سے اپنی خداوندی کا سکہ جمائے بیٹھے تھے، خدائے لایزل کے سامنے

کس طرح جھک سکتے تھے۔ ان کا بے لگام نفس جو صدیوں سے قیود دینی سے نا آشنا تھا، مذہب کے قواعد وضوابط کی سختی کب برداشت کرسکتا تھا! نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان منافقین اور سکھ محاربین نے آنیوالے خطرہ کو بھانپ لیا اور اپنی مساعی کا رخ اس کے سدباب کی طرف پھیر دیا۔ حق اور باطل کے درمیان کشمکش شروع ہوگئی جو تین سال تک جاری رہی۔ اور بہت سے اتار چڑھاؤ کے بعد ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ میں وہ ٹریجڈی واقع ہوئی جس کی وجہ سے باطل غالب آگیا۔ اور حق کو ناگزیر اسباب کی وجہ سے مغلوب ہونا پڑا۔ مگر تحریک بالکل فنا پھر بھی نہ ہوئی۔ قبائلی علاقہ میں ایک کیمپ قائم ہوگیا اور اندرون ملک سے اس کو بدستور امداد پہنچتی رہی برطانوی سلطنت سے تصادم ہوئے، معرکے ہوئے، جنگیں ہوئیں۔ تختہ دار اور عبور دریائے شور کی سزائیں بھی دی گئیں۔ مگر یہ تلخ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ یہ ساری داستان کرب والم تاریخ کے رخ کو نہ بدل سکی اور تحریک شہید قصہ پارینہ بن کے رہ گئی۔

تحریک سید شہید کی صحیح نوعیت کسی تحریک کی صحیح نوعیت معلوم کرنے کے لیے جن چیزوں کا تجزیہ ضروری ہوتا ہے ان میں نصب العین، طریق کار اور تشکیل جماعت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے سید شہید کی تحریک کے نصب العین اور طریق کار پر ایک نگاہ ڈالنا مفید ہوگا۔ شاہ اسماعیل شہید نے جس وقت دہلی میں اپنے خیالات کو عوام تک پہنچانے کی مہم جاری کی، اس وقت مسلمانوں کی سیاسی زبوں حالی انتہائی درجۂ ذلت کو پہنچ چکی تھی۔ مغل شہنشاہ کے حدود سلطنت سمٹتے سمٹتے لال قلعہ کی دیواروں تک رہ گئے تھے۔ اور قلعہ کے اندر بھی بادشاہ کی ذات محض عظمت رفتہ کی ایک دردبھری یادگار تھی۔ کمپنی بہادر کے حدود اقتدار تمام ریاستوں اور حکومتوں کو اپنے دامن میں لپیٹتے لپیٹتے دہلی تک آپہنچے تھے۔ پنجاب میں سکھوں کی سکھا شاہی ضرب المثل بن رہی تھی۔ اودھ اور دوسری مسلمان ریاستیں معاہدوں کے بوجھ سے دم توڑ رہی تھیں۔ بظاہر حال کرنے کا کام اس وقت صرف یہی تھا کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کی سیاسی حالت درست کی جاتی اور اپنی تمام جدوجہد اسی ایک نکتے پر صرف کردی جاتی۔ کیونکہ داناؤں کا خیال ہے کہ زوال کا اصلی سبب سیاسی کمزوری اور معاشی بدحالی ہوتا ہے۔ اور جونہی یہ دونوں روگ دور ہوئے باقی تمام عوارض ازخود کافور ہوجاتے ہیں۔ یعنی سیاسی پوزیشن کا استحکام ہی وہ ابجد ہے جس کے سیکھنے سے فکری اور علمی عروج، اخلاقی اور تہذیبی ترقی کی ساری کتابیں ازبر کی جاسکتی ہیں

لیکن ہندوستان کی اسلامی تحریک کا داعی اس بنیادی فارمولے سے آنکھیں بند کر کے اور ملت کو اس کے حال پر چھوڑ کر صرف احیائے اسلام پر اپنی ساری توجہ مرکوز کر لیتا ہے۔ وہ سیاسی استیلاء کو پس پشت ڈال دیتا ہے اور اسلام نما ہندویت کی جگہ خالص اسلام پھیلانے میں ہمہ تن مصروف ہو جاتا ہے۔ وہ مفاد ملی کی جگہ صرف اس چیز کو اپنی مساعی کا محور بنا لیتا ہے کہ نسلی مسلمانوں کے دل و دماغ میں اصل اسلام کی تعلیمات اتار دے۔ اوہام و خرافات کی جگہ کتاب و سنت کو ان کا رہبر زندگی بنائے۔ علمی دنیا میں پامال شدہ راستوں پر چلنے کے بجائے تحقیق و اجتہاد کی راہ دکھائے۔ اور مسلم اور غیر مسلم سب کو اس دین کی طرف دعوت دے جس کے تمسک سے تمام انفرادی اور اجتماعی بیماریاں از خود دور ہو جاتی ہیں اور جس کے تبرّی سے اور تو سب کچھ حاصل ہو سکتا ہے لیکن وہ بیماریاں ہرگز دور نہیں ہوتیں جن کی تکلیف سے انسانیت ہمیشہ سے کراہتی رہی ہے۔

اس کے بعد دوسرا درجہ تشکیل جماعت کا آتا ہے۔ سیاسی تسلط حاصل کرنے کے لیے بس اتنا ہی کافی ہے کہ ان تمام لوگوں کو ایک مسلک تنظیم میں پرو لیا جائے جو سیاسی غلبہ حاصل کرنے کے لیے کسی قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار ہوں۔ خود ان کی اپنی زندگی میں کسی بنیادی تغیر کے واقع ہونے اور کسی ضابطے کی پابندی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ تحریک اسلامی کے داعی اس طریق تنظیم سے بالکل آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ وہ کہیں بھی مسلمانوں کو یہ دعوت نہیں دیتے کہ آؤ ہم ایک جتھا بنا کر اپنی عظمت رفتہ کی بازیافت کے لیے جدوجہد کریں۔ بلکہ وہ اس عظمت رفتہ کو جسے ہندی مسلمان کی تاریخ کا سنہری زمانہ قرار دیا جاتا ہے غیر اسلامی قرار دے کر اس پر کڑی تنقید کرتے ہیں۔ ان کی توجہ تمام تر صرف اس بات پر مرکوز ہے کہ اصل اسلام کو منقح اور واضح شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کریں۔ چنانچہ لاکھوں مسلمانوں میں سے صرف وہی لوگ جماعت میں شامل ہوتے ہیں جن کے دل و دماغ پر اسلام پوری طرح حاوی ہو جاتا ہے اور جن کی زندگی کا کوئی معمولی سے معمولی سا حصہ بھی ضابطۂ اسلامی کے حلقے سے باہر نہیں رہ جاتا اور جو سیاسی و معاشی، فکری و تمدنی، اخلاقی و معاشرتی غرض ہر شعبۂ زندگی میں کتاب و سنت کے بتائے ہوئے راستے سے یک سر مو انحراف نہیں کرتے، خواہ اس طرز عمل سے ان کی جان، مال، اور اولاد سب تباہ ہو جائیں۔ ذیل میں

کی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" (Our Indian musalmans) سے چند اقتباسات درج کیے جاتے ہیں جو جماعت شہید کی اصل دعوت اور طریق تنظیم پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔

سید صاحب کی جماعت کے اقتدار پر تبصرہ کرنے کے بعد لکھتا ہے:-

"بہرحال اس حیرت انگیز اقتدار کے سرچشمہ کی بنیاد فتنہ و فساد نہ تھی۔ سید احمد صاحب نے اپنی پیغمبرانہ زندگی کی بنیاد انھیں دو اصولوں کی نشر و اشاعت پر رکھی جن کو تمام مبلغین کام میں لاتے آئے ہیں۔ یعنی وحدانیت اور مساوات۔ انھوں نے الہامی یقین کے ساتھ عوام کی مذہبی حمیت سے انصاف چاہا۔ ان کے ملکی بھائیوں کے دلوں میں یہ مذہبی حمیت مردہ ہو چکی تھی اور صدیوں تک ہندوؤں سے میل جول سے ان کے اسلام میں بہت سی بدعات پیدا ہو چکی تھیں۔ ان پر یہ واضح ہو گیا تھا کہ اسلام کی حقیقی تعلیم بت پرستی کے مراسم کے نیچے دب چکی ہے۔" صد۶۸

جماعت میں شامل ہونے والے مسلمان اپنے نصب العین کو سمجھ لینے اور طریق کار کو اپنا لینے کے بعد جس قسم کی سیرت کے حامل ہوتے تھے وہ ہنٹر صاحب کے الفاظ میں یہ ہے کہ:

"جہاں تک میرا تجربہ ہے، یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ایک وہابی مبلغ (یعنی تحریک سید شہید میں شامل ہونے والا مسلمان) سب سے زیادہ روحانیت رکھنے والا، سب سے کم خودغرض اور بے لوث ہوگا۔" صد۱۱۱-۱۱۲

اور

"جیسا کہ میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے اور اب پھر بھی بڑی مسرت کے ساتھ اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ ان میں ہزارہا ایسے اشخاص بھی موجود ہیں جو واقعۃً بڑے ہی متقی اور نفس کشی کو اپنی زندگی کا غرض اولین تصور کرتے ہیں۔ یہی افراد اصل میں تمام جماعت کی برتری کا باعث ہیں۔ اور یہ انہی کی برکت ہے کہ اس جماعت کو دنیا دار لوگوں کی اکثریت بڑی عزت اور تقدس کی نظر سے دیکھتی ہے۔۔۔۔۔۔۔

اس وقت بھی بنگال کے جیل خانہ میں ایک بہت ہی بزرگ اور سفید ریش انسان قید ہے جس کا دامن زندگی ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک ہے۔" صد۱۶۶

ان اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ طریق تنظیم ایسا تھا جس میں مسلمان کہلانا یا مسلمان قوم کا ایک فرد

ہونا جماعت میں شمولیت کے لیے کافی نہیں تھا، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ پیش نظر محض کسی قوم کا سیاسی غلبہ نہیں تھا بلکہ پورے اسلامی نظام کا احیا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ جماعت کا ہر ہر فرد فکر و عمل کے جمیع دائروں میں جماعت کے نصب العین اور طریق کار کو پوری طرح اپنا چکا ہو، ورنہ نصب العین تک رسائی ناممکن تھی۔

طریق تنظیم اور اشاعت مقصد کے متعلق جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ تحریک کے مقصد اور جماعت کے نصب العین کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔ تاہم اگر مزید اطمینان کی ضرورت ہو تو ان خطوط کا مطالعہ کرنا چاہیے جو سید صاحب اور ان کے رفقا میدان عمل سے اطراف و جوانب میں بھیجتے رہتے تھے۔ ذیل میں سید صاحب کے اس خط کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے جو انھوں نے ۱۵ جمادی الثانی ۱۲۴۲ھ کو سردار بدھ سنگھ کے جواب میں لکھا جاتا ہے۔ مقصد جنگ کی تشریح فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

معلوم ہوتا ہے کہ میرا اس ہنگامہ آرائی اور معرکہ پیرائی سے جو مقصود ہے، آپ نے اس کو اچھی طرح نہیں سمجھا اور تب ہی آپ نے اس طرح کا خط لکھا۔ اب کان لگا کر سنیے اور غور کر کے سمجھیے کہ اہل حکومت و ریاست سے لڑائی جھگڑا چند اغراض سے ہوتا ہے۔ بعض آدمیوں کا مقصود مال و ریاست کا حصول ہوتا ہے، بعض کو محض اپنی شجاعت اور دلیری دکھانی ہوتی ہے اور بعض آدمیوں کا مقصد شہادت کا مرتبہ حاصل کرنا ہوتا ہے لیکن میرا مقصد ہی دوسرا ہے اور وہ فقط اپنے مولیٰ کے حکم کی بجا آوری جو مالک مطلق اور بادشاہ برحق ہے۔ اس نے دین محمدی کے بارے میں جو حکم دیا ہے محض اس کی تعمیل مقصود ہے۔ خدائے عز و جل گواہ ہے کہ میرا اس ہنگامہ آرائی سے کوئی دوسرا مقصد نہیں اور اس میں کوئی نفسانی غرض ہرگز شامل نہیں .... مختصر یہ کہ مجھے نہ اپنی شجاعت کا اظہار مقصود ہے نہ ریاست کا حصول۔[۵]

سید صاحب نے عسکری مہمات شروع کر دیں اور کچھ علاقہ ان کے قبضہ میں آگیا تو انتظامی امور کے پیش نظر یہ محسوس کیا گیا کہ نظام حکومت کے قیام کے لیے فوری کارروائی ہونی چاہیے۔ چنانچہ خالص اسلامی نظام سیاست کے مطابق حکومت کی تشکیل کی گئی اور سید صاحب اس کے امام (Head) منتخب ہوئے۔ قیام حکومت

---

[۵] سیرت سید احمد شہید، صفحہ ۱۵۷۔ ترجمہ از فارسی خط

کے بعد سید صاحب نے اطراف و جوانب میں اطلاع نامے (Declarations) جاری کیے اور لوگوں کو اس نئی طرز کی حکومت سے روشناس کیا۔ ان اطلاع ناموں میں اس بات کی طرف بار بار توجہ دلائی گئی ہے کہ اس ہنگامہ آرائی کا مقصود حصول ریاست و سلطنت یا قومی تغلب و تسلط نہیں ہے بلکہ محض اسلامی نظام زندگی کو قائم کرنا ہے[۱]۔ چنانچہ ایک اعلان نامہ یوں شروع ہوتا ہے:

"اہل انصاف و ہدایت سے پوشیدہ نہیں کہ اہل کفر و ضلال سے جو جنگ و جدال اور قتل و قتال ہوتا ہے، اگر محض مال و عزت اور حکومت و ریاست حاصل کرنے کے لیے ہو تو اللہ کے یہاں اس کا کچھ اعتبار نہیں۔ اور اگر نصرت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ اور ترویج سنت نبوی کے لیے ہو تو اس کو عرف شرع میں جہاد کہتے ہیں اور وہ تمام عبادات سے افضل اور تمام طاعات سے اکمل ہے[۲]۔"

مولانا اسماعیل شہید جو سید صاحب کی تحریک کے اصلی روح رواں تھے، ایک طویل خط میں جو تحریک کے متعلق بعض شبہات کے ازالہ کے لیے لکھا گیا تھا، اپنی جد و جہد کی ناکامی اور کامیابی کے امکانات پر تبصرہ کرتے ہوئے نادر شاہ کا ذکر کرتے ہیں کہ کس طرح ایک معمولی انسان بے سروسامانی کی حالت میں جد و جہد شروع کرتا ہے اور پھر بالتدریج کامیابی کے منازل طے کرتا ہوا ایک ملک کا بادشاہ بن جاتا ہے اس کے بعد فرماتے ہیں:-

"کس قدر بے انصافی ہے کہ جو شخص محض دنیا کی طلب میں کمربستہ ہوتا ہے، اس کے حق میں فتح و نصرت کا گمان کیا جاتا ہے اور اسی گمان پر اس کا ساتھ دیا جاتا ہے۔ اور جو شخص محض اللہ کے لیے اور اللہ کی خوشی کے لیے، دین کی مدد کے لیے کھڑا ہوتا ہے اس کے حق میں فتح و نصرت کا حصول مستبعد سمجھا جاتا ہے[۳]۔"

یعنی ایک مسلمان بادشاہ کی ساری ترکتازیاں محض دنیا کی طلب ہے۔ اگر ان کا مقصود اللہ کی رضا نہ ہو اور اگر اللہ کی رضا مقصود ہوگی تو پھر بادشاہت اور سلطنت کا قصہ ختم ہو جائے گا۔

---

[۱] یہ ایک علیحدہ امر ہے کہ اسلامی نظام زندگی کا نفاذ قیام ریاست اسلامی کو مستلزم ہے۔ جو چیز قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ اصل مقصود مطلق حصول اقتدار نہیں بلکہ اجتماعی اور انفرادی زندگی میں چند اصولوں کا نفاذ ہے جس کے نتیجہ میں اقتدار حاصل ہوتا ہے۔
[۲] سیرت سید احمد شہید ص ۱۵۹ [۳] ایضاً ص ۱۶۷

ان اقتباسات سے خود قائدین تحریک کی زبانی اور بین طور پر معلوم ہو گیا کہ سید شہید کی تحریک کا مقصد وحید اسلامی نظام زندگی کا قیام اور جاہلی نظام زندگی کی بیخ کنی تھا۔ مال و عزت، جاہ و حشمت، ریاست و سلطنت اور قومی و ملکی غلبہ کوئی چیز ان کے پروگرام میں شامل نہ تھی۔ چنانچہ جہاں کہیں بھی اس جماعت کو اقتدار حاصل ہوا اس نے اپنی تمام تر توجہ نظام شرعی کے قیام پر مرکوز کر دی۔ فرائض اسلامی کے سلسلہ میں حکومت کا احتساب، زکوٰۃ اور عشر کی تحصیل، حدود شرعی اور تعزیرات اسلامی کا نفاذ، یہ وہ جلی عنوانات ہیں جو آفتاب نصف النہار کی طرح تحریک شہید کی صحیح نوعیت کو بیان کر رہے ہیں۔ نظم جماعت میں کتاب و سنت کے سوا کوئی اور چیز معیار حق نہ نمونہ ٹھیری۔ چاہے مصلحت وقتی اس بات کی کتنی ہی متقاضی ہو کہ کسی اور نظم کو اختیار کیا جائے۔

ممکن ہے بعض لوگ ان اقتباسات سے بھی مطمئن نہ ہوں اور ان کو محض ایسے دعاوی سمجھیں جن کو واقعات سے کوئی مطابقت نہ ہو۔ ان کے اطمینان کے لیے ایک ایسے شخص کی شہادت نقل کی جاتی ہے جسے تحریک سے یقیناً کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ ہنٹر اپنی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" میں لکھتا ہے:-

"ہندوستان میں انگریزی راج کی بدقسمتی ہے کہ اصلاح (یعنی اصلاح بدعات جو تحریک شہید کا مقصد تھا) کو خرافتوں کے خلاف نفرت و حقارت کے ساتھ لازم و ملزوم ہو گئی ہے۔ لیکن جہاں کہیں بھی مسلمانوں نے اپنے مذہب کے ابتدائی اصولوں کو اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہاں ان کو حکومت وقت کے خلاف بغاوت کرنا پڑی ہے"۔[۱]

یعنی سکھوں یا انگریزوں سے مقابلہ تو ایک ضمنی چیز تھی۔ اصل چیز مذہب کے ابتدائی اصولوں کو خود اختیار کرنا اور دوسروں سے اختیار کروانا تھا۔

پھر ایک دوسری جگہ لکھتا ہے:-

"انھوں نے ہندوستان میں ایک ایسا مذہبی انقلاب برپا کر دیا جس کی مثال اس کی گذشتہ تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہی انقلاب ہے جس نے پچاس سال سے انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کی روح کو دبنے نہیں دیا"۔[۲]

۱۔ "ہمارے ہندوستانی مسلمان" ص ۱۵۱۔ ۲۔ ایضاً ص ۹۵-۹۶

ہندوستان میں مسلمانوں کے ہاتھوں بہت سے انقلابات واقع ہو چکے ہیں۔ لیکن ایک معاند مورخ کو بھی مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں صرف یہی ایک انقلاب ایسا نظر آتا ہے جس کی نظیر بجا طور پر ملک کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ کیونکہ اس کے مقاصد فی الحقیقت ان مقاصد سے مختلف تھے جن کی خاطر آج تک انقلاب برپا ہوتے رہے تھے۔ اس انقلاب کی مخالفت غیر مسلموں ہی کی طرف سے نہیں بلکہ مسلمانوں کی طرف سے بھی، اور خاص کر جاگیرداروں اور مذہبی رہنماؤں کی طرف سے بہت زیادہ ہوئی تھی۔ کیونکہ اس انقلاب کا مقصد محض قومی استیلاء اور ملی مفاد نہیں تھا جس کے لیے ہر کوئی بلا کھٹکے اپنے آپ کو پیش کر دیتا۔ بلکہ یہ ان اصولوں کے لیے تھا جن کے اجراء سے مسلمہ حقوق یا مخصوص مفاد (Vested interests) سخت خطرے میں پڑ جاتے تھے عام اس سے کہ وہ مفاد خود مسلمانوں کے ہوں یا غیر مسلموں کے۔ چنانچہ تحریک کے اس پہلو کے متعلق ہنٹر صاحب لکھتے ہیں:-

"دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی زمیندار اور مذہبی رہنما متفقہ طور پر ہر قسم کے انقلاب سے ڈرتے ہیں۔ مسلمان زمیندار ویسے ہی مسجدوں کی حفاظت کرتا ہے جیسے انگریز زمیندار قائم شدہ گرجوں کی۔ مسلمہ حقوق کے لیے جھگڑے کا وجود ہمیشہ خطرناک ہوتا ہے خواہ وہ سیاسی ہو یا مذہبی۔ ہندوستان کے وہابی (یعنی تحریک شہید کے علمبردار) دونوں پہلوؤں سے سخت انقلاب پسند واقع ہوئے ہیں۔"[۵۵]

الغرض سید احمد کی تحریک اسلامی کی اصلی غرض و غایت صرف اتنی تھی کہ جاہلی نظام زندگی کو اکھیڑ کر اس کی جگہ خالص اسلامی نظام زندگی کو نافذ کیا جائے۔ تحریک کا عسکری پہلو اگرچہ اول بالاکوٹ میں سکھوں کے ہاتھوں اور پھر سرحد پار انگریزوں کے ہاتھوں بالفعل ختم ہو گیا۔ لیکن اس کا فکری اثر کسی نہ کسی صورت میں ہندوستان کی مسلم سوسائٹی میں ہمیشہ موجود رہا ہے۔ اور یہ اسی کا اثر ہے کہ آجکل مسلمانوں کی ہر جماعت خواہ وہ کسی راستہ پر چل رہی ہو، اپنی حرکت کو تحریک شہید کی صدائے بازگشت قرار دینے میں فخر محسوس کرتی ہے۔ لیکن مندرجہ بالا اقتباسات یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں کہ سید شہید کے پیش نظر اقامت دین کے سوا کوئی اور مقصد نہیں تھا۔ وہ نہ تو کوئی ایسی جمہوری ریاست (Democratic state) قائم کرنے کے لیے نکلے تھے جس میں

[۵۵] "ہمارے ہندوستانی مسلمان" صفحہ ۱۴۳

حاکمیت عوام کے سپرد کر دی گئی ہو اور عوام کی منتخب کردہ مجلس قانون ساز جس کو خود عوام نے قانون سازی کی سند عطا کی ہو۔ صرف اس لیے وجود میں لائی گئی ہو کہ وہ بلا قید و شرط قانون بنائے اور نافذ کرے۔ نہ ہی وہ کوئی ایسی مطلق العنان ریاست قائم کرنے آئے تھے جو ایک خود مختار، سرکش اور رب الارباب ڈکٹیٹر کی ہوائے نفس کی تابع ہو۔ اور نہ ہی وہ مسلمانوں کی وہ شوکت رفتہ جو سلطنت مغلیہ کی صورت میں کئی صدیوں تک اپنا پرچم لہراتی رہی تھی، دوبارہ واپس لانے کے لیے اپنی جان جوکھوں میں ڈال رہے تھے۔ ان کے سامنے صرف ایک مقصد تھا۔ اسلام۔ ایک اجتماعی اور انقلابی اسلام۔ وہ اسلام جو ہر ذوق صحیح اور طبع سلیم سے صرف ایک ہی مطالبہ کرتا ہے کہ انسان اپنی جملہ خود مختاریوں سے دست بردار ہو کر خدا تعالیٰ کا وفادار اور مطیع بندہ بن جائے۔ اور اس سانچے میں ڈھالنے والے دوسرے رفقاء سے مل کر ایک ایسا جتھا بنائے جو ہر قسم کی نفسانی اغراض سے پاک ہو کر اسلام یعنی فطری نظام زندگی کو دنیا میں بالفعل قائم کرنے کے لیے اپنی پوری سعی صرف کر دے۔ اور اگر باطل اپنی فطرت کے لحاظ سے اتنا ہٹ دھرم واقع ہو کہ اس خالص انسانی اور بے لوث کام میں خواہ مخواہ رکاوٹ بنے تو محض انسانیت کی خاطر اور ظلم و فساد کو دنیا سے مٹانے کے لیے اس سے نبرد آزما ہو۔ اور اس طرح صرف ان بنیادوں پر نظام اجتماعی کو قائم کر دے جن پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رفقاء نے عرب میں کیا تھا۔